AL-MISBAH
RESEARCH JOURNAL
المصباح ریسرچ جرنل
**ISSN (Online): 2790-8828. ISSN (Print): 2790-881X.**
Volume III, Issue III
Homepage: https://reinci.com/ojs3308/index.php/almisbah/index
Category Y
Link:https://hjrs.hec.gov.pk/index.php?r=site%2Fresult&id=1089437#journal_result

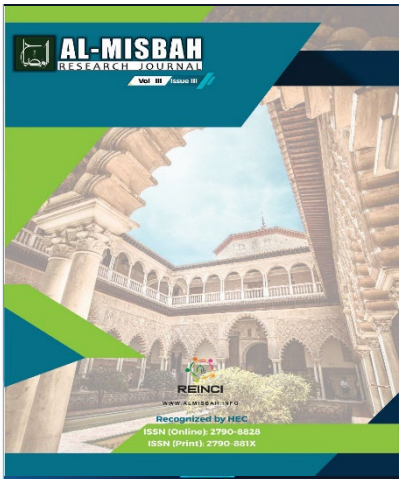


**Article:** محمد حمید شاہد کے منتخب افسانوں میں عالمگیریت کے مضمرات کی عکاسی: ایک تجزیہ

**Authors & Affiliations:**
[1] **Itrat Batool**
*Instructor, Department of Urdu, VUP, LRO Lahore*
[2] **Dr. Aqlima Naz**
*Assistant Professor, Department of Urdu Zuban-O-Adab, Fatima Jinnah Women University, Rawalpindi.*
**Email Add:**
[1] itrat.batool@vu.edu.pk
[2] aqlimanaz@fjwu.edu.pk

**Published:** 2023-09-30
**Article DOI:** https://doi.org/10.5281/zenodo.10701106
**Citation:** Itrat Batool, and Dr. Aqlima Naz. 2023. "محمد حمید شاہد کے منتخب افسانوں میں عالمگیریت کے مضمرات کی عکاسی: ایک تجزیہ: A REFLECTION OF IMPLICATIONS OF GLOBALIZATION IN M. HAMEED SHAHID'S SELECTED SHORT STORIES: AN ANALYTICAL STUDY". AL MISBAH RESEARCH JOURNAL 3 (03):1-15. https://reinci.com/ojs3308/index.php/almisbah/article/view/224.

**Copyright's info:** Copyright (c) 2023 AL MISBAH RESEARCH JOURNAL

This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License.

**Published By:** Research Institute of Culture and Ideology, Islamabad.

**Indexation's**

REINCI

AL-MISBAH RESEARCH JOURNAL
Vol.3, No.3, Sep-2023
Page no: 183-197

# محمد حمید شاہد کے منتخب افسانوں میں عالمگیریت کے مضمرات کی عکاسی: ایک تجزیہ

# A REFLECTION OF IMPLICATIONS OF GLOBALIZATION IN M. HAMEED SHAHID'S SELECTED SHORT STORIES: AN ANALYTICAL STUDY

*Itrat Batool
**Dr. Aqlima Naz

## ABSTRACT

The echo of Globalization is not new in exiting time period. Globalization has influenced all the aspects of life of all the societies including third world countries as well. Globalization brought a huge cultural devastation especially in third world societies. It also affected literature along with other aspects of such societies. Pakistan is also included in this list and so its literature also consumed different outcomes of globalization as a theme or a sub-theme. Implications of globalization are commonly discussed in contemporary Urdu short story to reflect the social issues generated by globalization. Hameed Shahid also contributed in this stream of short story. In this article, different shades of implications of globalization in selected short stories of Hameed Shahid are discussed to grasp the attention of the reader towards the hidden issues generated by globalization penetrating silently in our society.

**Key Words:** Globalization, Third World Countries, Cultural Devastation, Implications of Globalization, Contemporary Urdu Short Story, Hameed Shahid

ادب اور دیگر شعبہ ہائے زندگی میں عالمگیریت کی اصطلاح نئی نہیں۔ عالمگیریت انگریزی اصطلاحGlobalizationکا ترجمہ ہے۔ اس سے مراد دورِ حاضر کا وہ جدید معاشی اور سماجی نظام ہے جس کے تحت دنیا یکساں نظامِ زندگی کی طرف قدم بڑھانے کی کوشش کر رہی ہے۔ لیکن عملاً ایسا ممکن نہیں۔ اس دوڑ میں پست معاشرے ہانپ چکے ہیں اور وہ مہذب معاشروں کے قدم سے قدم ملا کر چلنے کی سعی میں ناکام ہو چکے ہیں۔ اس سعی میں ان معاشروں نے اپنی شناخت، ثقافت، طرز زیست حتیٰ کہ سوچ کا ڈھنگ تک عالمگیری تقاضوں کے تابع کرنے کی تگ و دو کی ضرور ہے لیکن اس کا خاطر خواہ نتیجہ بر آمد نہ ہو سکا، البتہ مذکورہ معاشروں نے اپنی ہی پہچان مسخ کر ڈالی۔ عالمگیریت کی وجہ سے رونما ہونے والے تغیر نے حیاتِ انسانی میں ایک نئے باب کی شروعات کر دی ہیں۔ تاہم عالمگیریت کے مطالب و مفاہیم سے اچھی طرح واقفیت حاصل کرنا عام آدمی کے لیے ممکن نہیں۔ مختلف ماہرین نے عالمگیریت کی مختلف تعریفات کی ہیں۔ کچھ کے مطابق یہ ایک خوش آئند قدم ہے اور کوئی اسے فتنہ قرار دیتے ہیں۔ اکثر ماہرین کا اتفاق ہے کہ یہ اصطلاح اگرچہ نئی ہے لیکن اس کے مفاہیم بہت پرانے ہیں اور یہ اصطلاح کسی نہ کسی شکل میں

* Instructor, Department of Urdu, VUP, LRO Lahore.
** Assistant Professor, Department of Urdu Zuban-O-Adab, Fatima Jinnah Women University, Rawalpindi.

تمام ترقی یافتہ زبانوں کا حصہ ہے۔ مختلف زبانوں میں اس اصطلاح کو مختلف الفاظ سے جانا جاتا ہے۔ عربی زبان میں اس کو "العولمۃ" کہتے ہیں۔ فرانسیسی میں اس کو "Mondialisation" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔[1]

زبان اردو کے حوالے سے دیکھا جائے تو عالمگیریت کا لفظ عالم سے مشتق ہے اردو زبان میں اس کے درج ذیل معانی ہیں۔ فرہنگ عامرہ کے مطابق:

"عالمگیر سے نسبت رکھنے والی کوئی چیز، دنیا کے اوپر چھا جانا۔"[2]

فرہنگِ آصفیہ میں اس کے معنی کچھ یوں بیان کیے گئے ہیں:

عالمگیر: "جہان کو لینے اور فتح کرنے والا، بادشاہ عظیم الشان، تمام عالم میں چھایا ہوا۔"[3]

مندرجہ بالا تعاریف سے عالمگیریت کی اصطلاح کی وسعت اور اس کے اطلاقی پہلوؤں کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ تمام عالم میں اس اصطلاح کو منفی و مثبت ہر دو تناظرات میں برتا جاتا ہے۔ شرقی عوام خصوصا مسلمانوں میں عالمگیریت کے حوالے سے جہاں منفی خیالات پائے جاتے ہیں وہاں مثبت پہلو بھی مدِ نظر رکھے جاتے ہیں۔ مغربی مفکرین عالمگیریت کو ایک خوش آئند، حسین، دلکش اور لوگوں کی خواہشات کے مطابق ڈھال کر پیش کرتے ہیں۔

عالمگیریت دراصل اقتصادی، سیاسی، ثقافتی و نظریاتی تغیر و تبدل کا عمل ہے جسے اختیار کرتے ہوئے صنعتی و تجارتی حدود کسی ایک ملک تک نہیں رہتیں بلکہ ان کا دائرہ پوری دنیا میں پھیل جاتا ہے اور ہوتے ہوتے یہ دائرہ ثقافتی حدود کو پھلانگنا بھی شروع کر دیتا ہے۔ عالمگیریت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ملکوں اور قوموں کے مابین رکاوٹیں ختم ہوں، انسانی معاشرے میں اختلاف و انتشار نہ ہو بلکہ مختلف سمتوں میں سفر کرنے کی بجائے تمام معاشرے ایک ہی راہ پر گامزن ہوں۔ امتیاز و تفریق کے بجائے مماثلت کا وطیرہ عام ہو اور پوری دنیا یکساں انسانی اقدار کو اختیار کر لے۔ مقامی و عالمی اعتبار سے صنعت اور خدمات و معلومات کے بیش بہا خزانے کو فروغ دینے، مغرب اور مغربیت کے تاجرانہ معیارات کو اور سیاسی نظاموں کو دنیا بھر میں تسلیم کر لینے کا نام عالمگیریت ہے۔ یہاں مغرب کو بااختیار فرض کر لینے کے پیچھے حقیقت یہ ہے کہ فی الواقع مغرب ہی ان تمام مذکورہ میدانوں میں پیش پیش ہے۔ لیکن عالمگیریت کا یہ تصور فقط کتابی ہے کیونکہ عملی طور پر مادی منفعت کے لیے کسی قوم کا تشخص مسخ کر دینا یا اس کی انفرادی حیثیت مجروح کر دینا اسے تسخیر کر لینے کا دوسرا نام ہے اور عالمگیریت کی رو سے مغربیت کو خدا مان لینا تمام ماتحت ممالک کی موت کے مترادف ہے۔

عالمگیریت کے ارتقا کو تین ادوار میں بانٹا جا سکتا ہے۔ دور اول سائنسی ایجادات کے بعد شروع ہوا کہ جب جاگیر دارانہ نظام کا خاتمہ ہو رہا تھا۔ انیسویں صدی کے آغاز میں سائنسی ترقی کی بدولت دنیا صنعتی مزاج سے آشنا ہو رہی تھی۔ اس دور میں بظاہر کھیت کا مزدور اور صنعت کا مزدور انسان دوستی کے خواہاں نظر آتے ہیں۔ تاہم اس دور میں صنعتی مزدور پرانے ساہوکاروں کے ساتھ مل کر نیا صنعتی نظام متعارف کروا رہے تھے اور سرمایہ دار اپنے منافع کو بڑھانے کے لیے مزدوروں کا جینا حرام کر رہے تھے۔ اس حوالے سے ناصر عباس نیئر لکھتے ہیں:

"عالمگیریت کا دوسرا عہد روشن خیالی کے زمانے سے شروع ہوتا ہے جب یورپی اقوام نے اپنی سائنسی تحقیقات اور مخصوص فلسفیانہ تصورات کی بدولت نو آبادیاتی کی بنیاد رکھی۔ اس نظام کو صنعتی انقلاب نے مستحکم کیا اور یورپی اقوام نے مشرقی وسطی ایشیا اور امریکہ کے کئی ممالک کو اپنی نو آبادیوں میں شامل کر لیا۔"[۴]

ان حالات میں مختلف مفکرین نے نئے نظریات وضع کرنے شروع کر دیے۔ مارکس کے سرمایہ دارانہ مخالف نظریات بھی انہی حالات کی دین ہیں۔ انہی نظریات پر ۱۹۱۷ء میں روس اور بعد ازاں مشرقی دنیا میں انقلاب کی بنیادیں پڑیں۔ ۱۹۴۸ء میں چین میں بھی سیاسی انقلاب رونما ہوا اور اس طرح دنیا قطبی نظام میں تقسیم ہو گئی۔ سرمایہ دارانہ نظام کی حامل قوتیں امریکہ اور دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے زیر اثر چلی گئیں جبکہ روس، چین، پولینڈ اور رومانیہ وغیرہ اشتراکی نظام کے حامی تھے۔ اسی صورت حال پر بات کرتے ہوئے ناصر عباس نیئر لکھتے ہیں:

"دوسری جنگ عظیم کے بعد عالمگیریت کا تیسرا عہد شروع ہوا مگر مختلف انداز میں۔ نو آبادیات کا خاتمہ ہوا۔ مگر عالم گیریت کے مقاصد (معاشی، ثقافتی، غلبہ) کا حصول بااندازِ دیگر جاری رہا اب راست اقدام کی بجائے بالواسطہ اقدام کا رواج ہوا ہے۔"[۵]

اسی طرح نظریاتی سطح پر دونوں نظاموں کے درمیان سرد جنگ کا آغاز شروع ہو گیا۔ ویت نام کی جنگ اور افغانستان میں روسی مداخلت اسی دور کی یادگار ہیں۔ ۱۹۹۱ء میں افغانستان میں روس کی واپسی اور روس کی سلطنت کے خاتمے کے ساتھ ہی عالمی سطح پر طاقت کا توازن ایک نظام کے حق میں بڑھ گیا اور یوں امریکہ کو کھیل کھیلنے کا موقع مل گیا جو سرمایہ دارانہ نظام کا سب سے بڑا محافظ تھا۔ اس تغیر نے دنیا کی ہر بستی کو ہلا کر رکھ دیا۔ عالمگیریت نے تمام شعبوں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے جن میں سیاست، اقتصادیات، مذہب، ثقافت سب شامل ہیں۔ بعض ماہرین کے مطابق عالمگیریت کے تحت مقامی ثقافتیں اپنی شناخت کھو رہی ہیں۔ مقامی کاروبار متاثر ہونے سے ملکی بے روزگاری میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ چائلڈ لیبر کے ساتھ ساتھ جرائم اور دہشت گردی بھی بڑھی ہے۔ تاہم عالمگیریت کے حامی اس نظریے کو خوش آئند قرار دیتے ہیں۔ ان کے مطابق عالمگیریت کو دنیا کو وسیع کرنے کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔ یعنی تمام ممالک ایک دوسرے کے ساتھ روابط اور تجربات بڑھا سکیں، ایک دوسرے کے تجربات سے مستفید ہو سکیں۔ اس کی بہترین مثال کمپیوٹر سائنس اور ٹیلی ویژن ہے۔

عالمگیریت نے جہاں ہر شعبے کو متاثر کیا ہے وہاں اردو زبان و ادب کا بھی اپنا الگ تھلگ وجود رکھنا ممکن نہیں۔ عالمگیریت کے تحت دنیا میں رابطے اور علمی و ادبی ترسیل کی ایک زبان کے فروغ کے لیے اردو سمیت دنیا کی بیشتر زبانیں متاثر ہوئی ہیں۔ عالمگیریت کے تناظر میں دیکھا جائے تو پوری دنیا میں زبانوں کی رنگا رنگی، انسانی اور ثقافتی تنوع کے لیے خطرہ اور دھمکی بن چکی ہے۔ سوائے انگریزی کے تمام زبانیں نئے بحران کا شکار ہیں۔ دوسری جانب عالمگیریت کا یہ فائدہ ضرور ہوا ہے کہ ایک زبان کا ادبی ورثہ اور ادب ترجمہ ہو کر دوسری زبان میں شامل ہوتا ہے تو اسے نئے مفاہیم و تناظرات سے آشنا کرتا ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ تراجم سے ہر زبان کو نئے خیالات، اسلوب اور نئی تکنیک سے متعارف ہونے کا موقع ملتا ہے۔ ادب کے اکثر رجحانات اور تحریکیں تراجم ہی کی دین ہیں۔ اس بات سے مفر نہیں کہ عالمگیریت نے اردو ادب کو وسعت عطا کی۔ ہمارے ادیبوں نے مذہب اور مذہبی شخصیات کے حوالے سے لکھے گئے ادب کا ترجمہ کیا۔ غیر ملکی ادب سے جو اصناف اردو ادب میں شامل ہوئیں ان میں

آپ بیتی، تمثیل نگاری، افسانہ، مضمون اور سفر نامہ کے ساتھ ساتھ ناول بھی شامل ہے۔ ڈرامہ بھی مغرب سے ہی اردو ادب میں آیا ہمارے ادیبوں نے یورپی ڈراموں کا ترجمہ کر کے لوگوں کو دوسری اقوام کے قریب کرنے کی سعی کی۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمارے انگریزی خواندہ طبقے نے ادبی فن پاروں کو جانچنے کے لیے جو اصول مقرر کیے انہیں تنقید کا نام دیا گیا۔ انہیں اصولوں کی روشنی میں اردو شعر و ادب کو جانچا گیا۔ اور پھر ان تراجم سے ہی عمل تنقید نے جنم لیا۔ عالمگیریت نے سائنس، ابلاغ اور ٹیکنالوجی کے ساتھ ساتھ اردو ادب میں بھی نئے رویے اور مباحث متعارف کروائے۔ عالمی ادب کے توسط سے اردو ادب میں جدیدیت کا غوغا بلند ہوا۔ یہ دراصل صنعتی شہروں اور ان کے رہائش پذیر لوگوں کے مسائل سے بحث کرتی ہے اس لیے اسے عالمگیریت سے خاص علاقہ ہے۔ عالمگیریت مختلف عناصر کی وجہ سے آگے بڑھی جن میں بین الاقوامی صنعت و تجارت، ذرائع ابلاغ، سیاست، ثقافت اور اشتہار شامل ہیں۔ ادیب بھی انہی عناصر سے عالمی سطح پر ظاہر ہونے والے واقعات سے آشنا ہوا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عالمگیریت کی وجہ سے ادب کی اہمیت میں بھی اضافہ ہوا۔ ادب مقامی سطح سے نکل کر عالمگیریت کی حدیں چھو رہا ہے۔ تاہم عالمگیریت کا منفی پہلو یہ ہے کہ عالمگیریت کی آڑ میں مختلف طاقتیں دولت، تجارت اور طاقت کے بل بوتے پر ایسی پالیسیاں بنا رہے ہیں جو عام انسانوں کے لیے اور خاص کر تیسری دنیا کے لیے خطرناک ہیں۔ نائن الیون، گلوبل وار اور دہشت گردی جیسے عناصر عالمگیریت کی ہی دین ہیں اور انہی کے پیش نظر ادب میں انسانی وجود کی بقا اور عدم تحفظ کی بابت سے مزید نظریے سامنے آنے لگے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر نجیبہ عارف لکھتی ہیں کہ:

> "گیارہ ستمبر کا واقعہ، جو اگرچہ پاکستان سے کوسوں دور کسی اپنی سرزمین پر رونما ہوا مگر اپنے عالمہ ہمہ گیر اثرات اور پاکستان کی مخصوص سیاسی و دفاعی نوعیت اور جغرافیائی حیثیت کے پیشِ نظر پاکستان کی سیاست، معیشت، معاشرت اور شہری زندگی کے امن و سکون پر شدت سے اور منفی طور پر اثر انداز ہوا، اردو فکشن اور شاعری دونوں میں بھرپور طریقے سے رونما ہوا ہے۔"[٦]

نائن الیون کے دھماکے کے ساتھ ہی تہذیبوں کا تصادم شروع ہوا جس کی گونج آج تک سنائی دے رہی ہے۔ اس واقعے نے پوری دنیا کو دو لخت کر دیا اور دنیا دو ادوار میں تقسیم ہو گئی۔ اردو زبان میں لکھے جانے والے جدید ادب میں ہیئت، انداز، الفاظ، تکنیک، معاشرت اور لباس سے لے کر کھانے پینے، سوچنے اور رہنے سہنے تک تمام موضوعات اور فنی خصائص تک عالمگیری اثرات کا مظہر ہیں۔ عالمگیریت کے تحت اردو ادب میں عالمی مسائل سے متعلقہ مضامین در آئے ہیں۔ اب دنیا میں کہیں بھی کسی بھی خطے میں کوئی واقعہ ہو، تازہ ترین تحقیقات و ایجادات، نظریات اور فلسفے اردو ادب بالخصوص، اردو ناول، افسانے اور شاعری کا حصہ بن رہے ہیں۔ اور ان کا اردو ادب میں ظاہر ہونا ہی عالمگیریت کے اردو ادب پر اثرات کو ظاہر کرتا ہے۔ اردو ادب میں جدید رجحانات کی بات کی جائے تو اس میں اب مٹی کی خوشبو سے زیادہ عالمگیریت کی بو محسوس ہوتی ہے۔ ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد کے مطابق:

AL-MISBAH RESEARCH JOURNAL
Vol.3, No.3, Sep-2023
Page no: 183-197

"عالمگیر ادب کا یہ رنگ و آہنگ صرف نظم کے قالب میں نہیں اترا بلکہ اردو ادب کی تمام تخلیقی اصناف نظم و نثر میں برابر اپنی جھلک دکھانے لگا ہے۔ اور تو اور اردو شاعری کی خاص تہذیبی صنف غزل بھی اس کے اثر سے محفوظ نہیں۔"[۷]

درج بالا بحث سے یہ تو ثابت ہو چکا ہے کہ عالمگیریت نے جس طرح معاشرے کی دیگر اقدار کو اپنی لپیٹ میں لیا اسی طرح ادب بھی اس سے اپنا دامن نہ بچا سکا۔ عالمگیریت کے مضمرات میں ثقافتی مغائرت، صارفی معاشرت، میڈیائی یلغار اور مقامیت کے انہدام جیسے مسائل شامل ہیں۔ عصری افسانے میں ان مضمرات کو موضوع بنایا جا رہا ہے جن میں حمید شاہد کے افسانے بھی شامل ہیں۔ مقالہ ہذا میں حمید شاہد کے منتخب افسانوں میں عالمگیری مضمرات کی عکاسی کا مطالعہ پیش ہے۔

محمد حمید شاہد کا افسانہ تہذیبی روایت کا معکوس اظہار ہے۔ ان کے افسانوں میں تہذیب، ثقافت اور اقدار کا معکوس رنگ نظر آتا ہے۔ ان کے افسانوی مجموعوں "مرگِ زار" اور "دہشت میں محبت" میں شامل افسانوں میں تہذیب و ثقافت میں واقع تغیر و تبدل کے عناصر واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ ثقافت کے کسی بھی پہلو میں کسی بھی وجہ سے واقع ہونے والی تبدیلی ثقافتی تغیر ہے۔ اسے ثقافتی مغائرت بھی کہتے ہیں۔ ثقافت متحرک ہے اور تحریک اس کا خاصہ ہے۔ جمود ثقافت کی نفی ہے۔ ثقافت کو اپنا وجود برقرار رکھنے کے لیے حرکت لازم ہے اور اس حرکت کے دوران اس کی شکل میں تبدیلی واقع ہونا ایک فطری عمل ہے۔ ثقافتی تغیر کا ایک اہم محرک یہ بھی ہے کہ جیسے جیسے ترقی پذیر انسانی معاشرے میں بدلتی اقدار کے ساتھ معیاراتِ زندگی بدلتے ہیں ویسے ویسے معاشرے کا جمالیاتی شعور بھی بڑھنے لگ جاتا ہے اور اس ذوق کی تشفی کے لیے بھی بہت سی دیگر ثقافتوں کو اپنے اندر ضم کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ جب ایک معاشرے کے اپنے مروجہ تہذیبی و ثقافتی ڈھانچے میں نئے معاشرتی مقصودات کی تکمیل نہیں ہوتی تو ثقافتی تغیر کا عمل از خود وقوع پذیر ہوتا ہے۔ ثقافتی تغیر کی مثال لباس جیسے اہم معاشرتی و ثقافتی عنصر سے ہی لی جا سکتی ہے۔ لباس ایک اہم ثقافتی اظہار ہے۔ اس ثقافتی اظہار کے تبدل کی ذیل میں محمد حمید شاہد کے افسانے "جنگ میں محبت کی تصویر نہیں بنتی" سے اقتباس ملاحظہ ہو:

"۔۔اس کی بیوی داخل ہوتی ہے۔ بال کٹے ہوئے، چست سی ٹی شرٹ اور اس ٹی شرٹ کے اوپر ایک دوسرے کو کاٹتی سرخ سیاہ موٹی دھاریوں اور کھلے گریبان والی لونگ شرٹ۔ اس نے نیچے ٹراؤزر پہن رکھا ہے سیاہ رنگ کا۔ شوہر نے بھی ملتے جلتے والے رنگوں اور باہم کاٹتی موٹی دھاریوں والی شرٹ پہن رکھی ہے۔"[۸]

مذکورہ خاتون کا حلیہ صاف بتا رہا ہے کہ اس کا لباس مشرقی سرحدوں سے نکل کر مغرب کی حدود میں قدم رکھ چکا ہے۔ کھلا گریبان مغربی لباس کی خاصیت کے ساتھ مشرقی عورت کے نظارے کی دعوت دے رہا ہے۔ مردِ مذکور بھی اس نظارے سے محظوظ ہوتے ہوئے ستر کے مقامی واجبات سے آنکھ چرائے ہوئے ہے۔ دراصل ثقافتی مغائرت کی ذیل میں مادی تہذیب کا حملہ اس قدر زور آور ہے کہ تمام تر مقامی ثقافت اور سماجی اقدار کی پامالی عام نظر آتی ہے۔ عریانی کا سیلاب ہر گھر میں وارد ہو چکا ہے اور معاملاتِ لباس اس قدر ہاتھ سے نکل چکے ہیں کہ خواتین بزرگوں کے سامنے سر ڈھانپنا تو درکنار، محارم و غیر محارم کی تمیز ختم کیے دیتی ہیں اور بے حجابی میں ان کو ذرا عار محسوس نہیں ہوتی بلکہ

اسے دورِ جدید کا لازمہ قرار دے کر قبول کیا جاتا ہے۔ یہی عنصر آج کے افسانے میں بھی عام نظر آتا ہے جس کی مثال اوپر درج کی گئی ہے۔ لباس تو فقط ایک مثال ہے۔ ثقافتی تغیر نے تو مذہب جیسے اہم ادارے کی بھی جڑیں کھوکھلی کر ڈالی ہیں۔ مذہبی معاملات کسی بھی معاشرے میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور انہی معاملات پر اکثر معاشرے استوار ہوتے ہیں لیکن عالمگیریت نے مذہبی اقدار پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ محمد حمید شاہد کے افسانے "گانٹھ" میں مذکورہ بالا مذہبی رجحان میں تغیر کا احوال درج ہے:

> "روشن خیالی میں سب کچھ روند کر آگے بڑھنے والوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ جلد ہی مذہبی فرائض کی بجا آوری کو قیمتی وقت کے ناحق تلف کرنے کے مترادف سمجھنے لگا تھا۔ اس کا خیال تھا ان فرائض میں صرف ہونے والا وقت کسی بھی انسان کو تسکین پہنچا کر امر بنایا جا سکتا تھا۔ اس کے لیے مذہبی طرزِ احساس فقط رجعت پسندی، جہالت اور ذہنی پسماندگی کا شاخسانہ تھا۔ لہٰذا وہ مذہب اور اس کے متعلقات کو ایک لایعنی گورکھ دھندا یا پھر افیون قرار دیتا اور خود کو ہمیشہ اس سے دور رکھا۔"[9]

یعنی وہ معاشرہ جس کی اساس ہی مذہب ہے، عالمگیریت کے زیرِ اثر ایسا بگڑا کہ مذہب کی حیثیت ہی افیون کے برابر ہو گئی۔۔ ایسے میں اس معاشرے کی اساسی حیثیت بالکل معدوم ہو جاتی ہے۔ عالمگیریت نے معاشرے کی ثقافتی اقدار کو اس قدر پامال کیا ہے کہ عمومی اعمال و افعال کا مذہب سے کوئی واسطہ نہیں رہا اور مذہب رسمِ محض بن کر رہ گیا ہے۔ حمید شاہد نے مذہب کی اسی مسخ شدہ صورت کو افسانے میں جگہ دے کر قاری کے ذہن پر نامحسوس انداز میں دستک دی ہے تاکہ ادراک کا در وا ہو سکے۔ یہ ثقافتی تبدل مذہب کے لیے تو مہلک ثابت ہوا ہی ہے ساتھ ہی اس تغیر کے پہیے تلے دیگر ثقافتی نشانات کو بھی بری طرح روندا گیا ہے۔ نام کی ہی مثال لے لیجیے۔ نام انسان کی ذات کی وہ پہچان اور شناخت ہے جو ما قبل پیدائش تا بعد از موت اس کے ساتھ نتھی ہے لیکن بعض اوقات اپنی اس پہچان کی تجدید کی خواہ مخواہ کی تعمیل سارا مناظرہ بدل دیتی ہے اور ایک ذات کی "توصیف" کی خوبی منہا معلوم ہوتی ہے۔ نام کے تبدل کی ذیل میں مذکورہ بالا افسانے سے قدامت سے جدت کے سفر کی ایک مثال پیش ہے:

> "اس نے اپنے وجود سے وابستہ آخری نشانی، اپنے نام "توصیف" کو بدل کر "طاؤس" ہو جانا بخوشی قبول کر لیا تھا۔"[10]

نام کے بگاڑ سے ہی اکثر شخصیت کے بگاڑ کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ نام انسان کی شخصیت کا نمائندہ ہوتا ہے اور اکثر صرف نام سن کر ہی تصور میں کسی شخص کا پورا خاکہ آ ٹھہرتا ہے۔ نام سے وابستہ صفات شخصیت کا تاثر قائم کرنے میں ممد ہوتی ہیں لیکن مغربی یلغار نے اہلِ مشرق کے پاس نام کا وظیفہ بھی نہیں رہنے دیا اور مشرقی فرد بہ خوشی مغرب زدہ نام اپنانے پہ مائل نظر آنے لگا۔ یہ سلسلہ فقط نام تک نہیں رکا بلکہ تمام اعمال و افعال میں ثقافتی مغائرت کی اچھاڑ پچھاڑ جاری نظر آتی ہے۔ جس طرح جدید معاشرے میں ناموں کا کینڈا بگڑا ہے ویسا ہی کچھ حال خاندان کے وظائف، بنیاد اور اہمیت کا بھی ہو چکا ہے۔ حلال قدروں کی جگہ پر گناہگار سوچیں آن ٹھہری ہیں۔ رشتوں کا استحکام باقی نہیں رہا اور خاندان جیسی اکائی کی خاص ضرورت ہی نہیں رہی بلکہ شادی کو بجائے معاشرتی کلیہ سمجھنے کے اسے بوجھ سمجھا جانے لگا ہے۔ خاندانی اور عائلی نظام کی یہ خرابی حقیقت کے ساتھ ساتھ افسانوں کا بھی موضوع بننے لگی ہے۔ مذکورہ بالا افسانہ "گانٹھ" میں عائلی نظام کا انہدام صاف نظر آتا ہے:

"۔۔کچھ اچھی لڑکیاں اس کی زندگی میں آئی ضرور تھیں مگر اتنی دیر کے لیے جتنی کہ دونوں میں سے کسی ایک کو ضرورت ہو سکتی تھی۔ لہٰذا جب ضرورت پوری ہو رہی تھی تو شادی کے پاکھنڈ کا کیا جواز ہو سکتا تھا۔"[۱]

شادی کی عدم اہمیت کا یہ رجحان مغرب سے ہمارے ہاں آیا ہے۔ اس کی بنیاد میں شادی کی بابت وہ لغو مغربی نظریات ہیں جن کا ہمارے معاشرے سے اصلاً کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح افسانہ "رکی ہوئی زندگی" کا مرکزی کردار شادی شدہ مرد ہونے کے باوجود غیر عورتوں سے مراسم رکھے ہوئے ہے جو مقامی عائلی قاعدے کی کھلی نفی ہے اور ثقافتی مغائرت کا کھلا اظہار ہے۔ یہ اور اس قبیل کے دیگر افسانے مقامی معاشرے کی ان بدلتی ہوئی اقدار کے واضح عکاس ہیں جن کا سرچشمہ مغرب ہے اور یہ تمام اقدار عالمگیری عمل کے نتیجے میں ہمارے معاشرے میں وارد ہوئی ہیں۔ شادی بیاہ کے معاملات سے دو قدم آگے بڑھ کر دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ عام زندگی کے ہر شعبے میں عالمگیریت کے زیرِ اثر پرانے طور طریقے دم توڑ چکے ہیں اور ہر جگہ جدت کا قد نمایاں ہے۔ محمد حمید شاہد کے افسانہ "آدمی کا بکھراؤ" میں بدلتی ہوئی معاشرت کا نمونہ دیکھیں:

"وہ ایک مدت میں شہری ہنگاموں میں کچھ اس طرح مشغول تھا کہ اسے ٹھیک طرح سے اندازہ نہیں تھا کہ دیہات کتنی تیزی سے بدل گئے تھے اور مسلسل بدل رہے تھے۔ گندم کٹنے کا جو منظر اس کے دھیان میں چل رہا تھا، کٹائی اور گہائی کی مشینوں کے آنے کے بعد اس میں بہت زیادہ ترمیم ہو چکی تھی۔"[۲]

ایسے میں چمکیلی و نوکیلی درانتیوں کا تصور جدید آدمی کے لیے زحمتِ محض کے سوا کچھ بھی نہیں، شاید یہ تصور اب فقط پینٹنگ بنانے کے لیے ہی رہ گیا ہے۔ ہمارا معاشرہ بنیادی طور پر زرعی معاشرہ ہے اور سرسبز و شاداب کھیت اور لہلہاتی فصلیں ہی اس کی ترقی اور سالمیت کی ضامن ہیں۔ شہروں میں آباد زیادہ تر آبادی کا تعلق بھی دیہات سے ہی ہوتا ہے اور شہری افراد دیہات سے اپنا تعلق جوڑے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن صنعتی یلغار نے ایک عام شہری کی سوچ کا زاویہ اس طرح بدل دیا ہے کہ اب شہری کا گاؤں سے رشتہ کمزور پڑنے لگا ہے۔ دوسری طرف گاؤں میں بھی زرعی کاموں کے لیے جدید مشینری کا استعمال عام ہونے لگا ہے تو شہر اور گاؤں میں خطِ تفریق مٹنے لگا ہے۔ جدید صنعتی انقلاب اور ثقافتی مغائرت کی بدولت متعارف ہونے والی جدت نے دیہات کا خالص پن چھین لیا ہے جس کی نشاندہی مذکورہ بالا حوالے میں کی گئی ہے۔ ثقافتی تبدیلیوں نے عام انسان کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا ہے اور چار و ناچار عام آدمی کو اپنا پرانا طرزِ زندگی بدل کر نیا انداز اپنانا پڑ جاتا ہے۔ ثقافتی یلغار کو محمد حمید شاہد کے افسانہ "آدمی کا بکھراؤ" میں بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے:

"اسے ایسا تہذیبی آدمی کہا جا سکتا تھا جسے ثقافتی بارشوں کی بوچھاڑ نے پس پا کر دیا تھا۔ اس کی پہلی بیوی فائزہ کو ہمیشہ شکایت رہی تھی کہ اس کے اندر گاؤں کا ضدی اور اکھڑ کسان دھرنا مارے بیٹھا ہوا تھا۔ زمین سے اُگا ہوا اور اپنے ایمان کے ساتھ جڑا ہوا آدمی۔ زمین پیچھے گاؤں میں رہ گئی تھی اور وہ ایمان ساتھ لیے پھرتا رہا۔ فائزہ چاہتی تھی کہ وہ تیزی سے ترقی کر کے سوسائٹی میں مقام بنا لے مگر جس بوجھ کو وہ اٹھائے پھرتا تھا وہ اس کی چال میں رخنے ڈال رہا تھا۔ وہ اس پر مسلسل کام کرتی رہی حتیٰ کہ اسے بدلنا پڑا۔"[۳]

مذکورہ بالا حوالے میں عورت کی بلند معیارِ زندگی کی خواہش اور سوسائٹی میں نام نہاد اعلیٰ مقام کی تمنا ایک ایسے مرد سے اس کی بنیاد چھین لیتی ہے جس کی جڑیں دیہاتی پس منظر سے جڑی ہیں۔ شوہر کو نہ چاہتے ہوئے بھی بیوی کی خواہشات کا اتباع کرنا پڑتا ہے۔ نتیجتاً وہ روایات سے کٹ جاتا ہے اور انسان کا اپنی روایات سے کٹاؤ ہی ثقافتی مغائرت کی سب سے بڑی نشانی ہے۔ روایات سے کٹنے کا یہ عمل بتدریج جاری رہتا ہے حتیٰ کہ معاشرے کی ساخت بالکل بدل جاتی ہے۔ اس کی ایک مثال مہمان نوازی کی ذیل میں ہی لے لیجیے۔ افسانہ "رکی ہوئی زندگی" میں مہمان کی بے توقیری کی مثال بھی ملتی ہے جو ایک بار پھر ہماری مقامی تہذیب کی نفی ہے اور یقیناً یہ بھی غیر معاشرت سے مستعار رویہ ہے۔ مثال ملاحظہ ہو:

"وہ ایک ٹرے میں پانی کی بوتل، گلاس، چنگیر اور رکابی رکھ کر اس کی سمت بڑھانے کے بعد لفظوں کو چبا چبا کر کہہ رہی تھی:

"جب وہ کھانا کھا چکیں تو اصرار کر کے انہیں روک نہ لیجیے گا۔"[۱۴]

یہاں مذکورہ لڑکی کا مکالمہ ہماری مقامی اقدار و معاشرت کے منافی ہے کیونکہ ہمارے مقامی معاشرے و مذہب میں مہمان نوازی ایک اہم قدر رہی ہے لیکن افسوس جدید طرزِ حیات نے اس قدر کو معدوم کر ڈالا ہے۔ درج بالا امثال سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمد حمید شاہد نے اپنی افسانوی نثر میں کھل کر عالمگیریت کے نقصانات اور پسماندہ معاشرے پر اس کے اثرات کو بیان کیا ہے۔ انہوں نے عائلی نظام جیسے اہم معاملات سے لے کر روزمرہ کی عام روایات و اقدار پر ثقافتی غلبے کے اثرات پر قلم اٹھایا ہے۔ وہ بے باک افسانہ نگار ہیں اور جذبات نگاری کی بجائے حقیقت سے پردہ اٹھانے کو ترجیح دیتے ہیں۔

جیسے جیسے زمانہ مائل بہ ارتقا ہے ویسے ویسے پسماندہ معاشروں کی مقامی تہذیب عالمگیریت کے مضمرات کی لپیٹ میں آتی جا رہی ہے اور مقامی ثقافت کا خاتمہ اس عصری ترقی کی خصوصی دین ہے۔ مغرب کی چکاچوند نے مشرقی تہذیب کو دھندلاہٹ میں دھکیل دیا ہے۔ مقامی تہذیب میں نئی مغربی اقدار کی نفوذپذیری تیزی سے جاری ہے۔ لوگ اپنی تہذیب سے فارق ہو رہے ہیں اور مغربی ثقافت کو اپنانا اپنے لیے باعث فخر سمجھ رہے ہیں۔ اس جدید طرزِ زندگی سے معاشرے سے مقامیت ختم ہو رہی ہے۔ نئے اردو افسانے میں بھی ان مقامی اقدار کے خاتمے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مقامیت کے خاتمے کی ایک مثال دیہات سے شہروں کی طرف نقل مکانی کی لی جا سکتی ہے۔ ایک دور تھا کہ دیہاتوں میں بسنے والے افراد اپنے ضروری کام سے شہر جاتے ضرور تھے لیکن ان کی سکونت دیہات ہی ہوتی تھی اور ان کا فطری اندازِ حیات ہی انہیں مرغوب ہوتا تھا۔ لیکن بدلتے ہوئے وقت میں شہروں کی چمک دمک نے دیہات کے باسیوں کو اس طرح اسیر کیا ہے کہ اب اکثریت شہروں میں زندگی گزارنے کو ترجیح دینے لگی ہے۔ نقل مکانی کا یہ رجحان مقامی تہذیب سے دوری کا محرک بن رہا ہے۔ مقامی روایات سے جڑت کو پسند نہیں کیا جا رہا ہے۔ شہروں کی جانب نقل مکانی کا ایک محرک یہ بھی ہے کہ دیہی بود و باش معیوب متصور کیا جانے لگا ہے۔ امراء اس بود و باش کو اپنے لیے طعنہ سمجھتے ہیں حالانکہ اسی میں ہم ماضی کی بازیافت کر سکتے ہیں۔ سنہرے مستقبل کے خواب لے کر لوگ شہروں میں منتقل تو ہو جاتے ہیں لیکن ساتھ ہی ماضی کی روایات کا خاتمہ بھی ہو جاتا ہے۔ روایت کے انہدام کی مثال محمد حمید شاہد کے افسانہ "کوئٹہ میں کچلاک" کے درج ذیل اقتباس میں دیکھی جا سکتی ہے:

"بشارت کا باپ مر گیا تو اس نے ساری زمینیں بیچ ڈالیں اور شہر میں آ کر بس گیا۔ یہی اس کے خاندان سے کٹتے چلے جانے کی وجہ بنا۔ اس نے شہر میں شیخوں کے خاندان میں شادی کر لی تو برادری نے جیسے اس کی طرف دیکھنا ہی چھوڑ دیا۔ وہ برادری سے ویسے بھی بے نیاز ہو گیا تھا اور اپنی زندگی میں مگن تھا۔ شہر میں اس نے زمینوں کا لین دین کیا، ٹھیکیداری کی اور جب وہ کوئٹہ منتقل ہوا تو پنجاب سے سرمائے کو سمیٹا اور گوادر میں ایک سوسائٹی کے نام سے بہت سی زمینیں خرید لیں۔ ملک بشارت کو یقین تھا کہ جب گوادر پورٹ میں ترقیاتی کام اگلے مرحلے میں داخل ہو گا تو یہی زمین سونا ہو جائے گی۔"[۱۵]

اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ پسماندہ علاقوں میں بہتر طرز زندگی اور بنیادی سہولیات کا فقدان ہے۔ اسی بات کو وجہ بنا کر اکثر لوگ شہروں میں آباد ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں یہ امر بھی واضح ہے کہ یہ نقل مکانی زیادہ تر اس طبقے میں دیکھنے میں آتی ہے جہاں زمین جائیداد کی ریل پیل ہے اور اعلیٰ زمین دار طبقہ جدید سہولیاتِ زندگی کی خواہش میں نقل مکانی اختیار کرتا ہے۔ دوسری طرف یہ رجحان بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ شہروں میں سرمایہ کاری کے بھاری منافع کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اکثر دیہی زمیندار اپنے سرمائے کو شہر میں منتقل کر دیتے ہیں۔ یہ رجحان بھی صارفی معاشرت کا تحفہ ہے ورنہ ماقبل سرمایے کی اتنی فوری منتقلی عام نہ تھی۔ غیر جانبداری سے دیکھیں تو نقل مکانی کا شمار ملک کے اہم مسائل میں ہوتا ہے۔ اگر اس مسئلے کی روک تھام کے لیے بروقت تدابیر نہ کی گئیں تو گنجان آباد شہروں کے مسائل میں اضافے کا امکان ہے۔ شہری زندگی پر مغربیت کے اثرات واضح ہیں۔ درحقیقت مغربی ثقافت کا ہماری ثقافت کے ہر پہلو پر اثر پڑ رہا ہے جس میں لباس، اندازہائے گفتگو اور کھانے پینے کے معمولات سرِ فہرست ہیں۔

اردو افسانے کے اوائل نمونوں میں معاشرے میں سادگی کا عنصر نمایاں ہے۔ سادہ طرزِ زندگی میں خالص جذبات کی عکاسی افسانے کا حاصل ٹھہرتی تھی۔ رفتہ رفتہ زندگی کے انداز میں جدت آتی گئی اور حقیقی زندگی کے ساتھ ساتھ افسانوی زندگی کے رنگ بھی بدلنے لگے۔ صارفی رجحان کی جھلک افسانوں میں بھی نظر آنے لگی۔ صارفیت سے مراد کسی شے یا خدمت کی خریداری کا وہ فعل ہے جس کے نتیجے میں مذکورہ شے یا خدمت کی مانگ میں اضافہ ہوتا ہے اور اسی حوالے سے اس کی خرید کا عمل بھی فزوں تر ہوتا ہے۔ یہ دراصل ایک ایسا ذہنی رجحان ہے جو اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے درمیانی دور میں وقوع پانے والے صنعتی انقلاب کی دین ہے۔ اس انقلاب نے برطانیہ جیسے خطے کی معاشرتی و معاشی زندگی میں تغیر برپا کیا تھا۔ اس انقلاب کے تحت زراعت، ذرائع نقل و حمل، ابلاغ اور سائنس کے مختلف شعبہ جات نے حیرت انگیز ترقی کی۔ دیکھتے ہی دیکھتے تمام یورپ اور شمالی امریکہ اس ترقی کی لپیٹ میں آ گیا۔ مذکورہ بالا شعبہ ہائے زندگی نے جدید صنعت کا نظام وضع کیا۔ اسی نسبت سے ترقی کی اس لہر کو صنعتی انقلاب سے معنون کیا گیا۔ قلیل دورانیے میں اس صنعتی انقلاب نے پوری دنیا کو متاثر کیا حتیٰ کہ یہ صارفی رجحان ادب کا موضوع بھی بننے لگا۔ صارفی معاشرے کی ایک مثال محمد حمید شاہد کے افسانہ "کوئٹہ میں کچلاک" میں مذکور کوئٹہ شہر کی ایم اے جناح روڈ کی صورت حال سے ہوتا ہے:

"اس ایک روڈ پر اکتالیس سے زیادہ بنک تھے، بھرپور بزنس کمانے والے بنک۔"[۱۶]

بینکوں کی یہ بھرمار صارفی رجحان کی مظہر ہے۔ بینک معیشت کا اہم رکن ہیں۔ معیشت کی حقیقت، اس کی طاقت اور اہمیت کو اگر ہم تاریخ اور عصر حاضر دونوں میں جھانک کر دیکھیں تو حقائق کھل کر ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ معیشت کی اہمیت واثرات کو انفرادی، خاندان ، رشتہ دار، معاشرہ، ریاست اور ملک غرض ہر جگہ واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ ساتھ ہی ایک صارفی معاشرے میں ہمیں یہ باور کرادیا گیا ہے کہ تہذیب یافتہ زندگی گزرانے کے لیے برانڈ کو اپنانا لازم ہے۔ عالمگیری عہد میں ہر شے کی خرید اور فروخت ممکن ہے۔ یہ دور صارف کی پیداوار کا ہے۔ اس دور میں شے کی پیداوار اتنی اہم نہیں ہے جتنی صارف کی پیداوار ہے۔ اس لیے ہر شے کا کوئی نہ کوئی جواز ہے۔ کوئی شے بے مصرف نہیں۔ اشتہارات کے بل پر شے کے صارف ازخود پیدا کر لیے جاتے ہیں۔ یہی صارفی رجحان ہے کہ جہاں ضرورت سے زیادہ تشہیر مقدم ہے۔ محمد حمید شاہد کے افسانہ "آدمی کا بکھراؤ" میں بدلتے ہوئے صارفی رجحان کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے:

> "اس کے پاس نئے ماڈل کی ایسی کار تھی جس کے شاک بہت اچھے تھے۔ اتنے اچھے کہ کار سڑک پر بچھ کر اور جم کر چلتی تھی اور آدمی کے دھیان کو بھی جھٹکا نہیں لگتا تھا۔"[۱۷]

درج بالا مثال اس امر کی مظہر ہے کہ اگرچہ گاڑی موجودہ وقت کی اہم ضرورت ہے، عوام شائق بھی ہیں۔ نئے ماڈل کی گاڑی تو ہر ایک کو پسند ہوتی ہے۔ پاکستانی معاشرے میں اچھی گاڑی معاشرے میں اعلیٰ مقام کی ضامن سمجھی جاتی ہے۔ اور اگر گاڑی نئی ہو تو اس کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے۔ صارفین کی ایک بڑی تعداد کی قوت خرید کم دیکھی گئی ہے۔ اس کے باوجود ہر نئے آنے والے ماڈل کی خرید بکثرت دیکھی گئی ہے۔ لوگ پرانی گاڑی کو نقصان پر صرف اس لیے بیچ دیتے ہیں کیونکہ اس نقصان کے عوض وہ نئی گاڑی کا مہنگا سودا کرتے ہیں جس سے انہیں معاشرے میں مقام و مرتبہ نصیب ہوتا ہے۔ بعض اشیا جو کبھی کسی خاص طبقے سے مخصوص تھیں، مثلاً ٹیلی ویژن، کمپیوٹر، ائیر کنڈیشنڈ وغیرہ، یہ عام طبقے کے لیے ممنوع متصور ہوتی تھیں۔ عالمگیریت کی وجہ سے یہ چیزیں عام ہو چکی ہیں اور اب ہر طبقہ ان کے حصول کے لیے کوشاں ہے۔ حمید شاہد کا افسانہ ان تمام عالمگیری عناصر کا بہترین اظہار ہے۔ معاشرے پر استعمار کا غلبہ اور اس کے نتیجے میں انسانی نفسیات پر منفی اثرات اور انسان کا احساسِ شکست نئے افسانے کا خاص موضوع ہیں۔ مشرق و مغرب کا تضاد فرد کے داخلی اضطراب کی اہم وجہ ہے۔ آج کا صارفی عہد انسان کے عدم اطمینان اور تنہائی کا محرک ہے۔ اس ضمن میں محمد حمید شاہد کے افسانے "موت منڈی میں اکیلی موت کا قصہ" میں ایک تنہا موت کا المیہ دیکھیے:

> "جب نخوت کا مارا امریکا اپنے پالتو اتحادیوں کے ساتھ ساری انسانیت پر چڑھ دوڑا اور اعلیٰ ترین ٹیکنالوجی کے بوتے پر سب کو بدترین اجتماعی موت کی باڑھ پر رکھے ہوئے تھا، وہ اسلام آباد کے ایک ہسپتال میں چپکے سے اکیلا ہی مر گیا۔"[۱۸]

درج بالا حوالے سے مصنف یہ پیغام دینا چاہتا ہے کہ ایک طرف تو موت اس قدر عام ہو گئی ہے کہ امریکہ نواز پالیسیوں کے زیرِ اثر ہونے والی سینکڑوں اموات کی باقاعدہ تشہیر کی جاتی ہے اور میڈیا کے ذریعے ہر گلی محلے تک ان اموات کی خبر پہنچادی جاتی ہے۔ دوسری جانب انفرادی سطح پر فرد کی تنہائی کا یہ حال ہے کہ ہسپتال میں انتہائی خموشی سے مر جانے والے انسان کے سرہانے ایک رسمی آہ بھرنے کے لیے بھی کوئی

زندہ شخص موجود نہیں ہوتا۔ حمید شاہد نے فرد کی موت کی بے بسی کو اپنے اکثر افسانوں میں موضوع بنایا ہے۔ مثال کے طور پر محمد حمید شاہد کے افسانے "آدمی کا بکھراؤ" میں انسان کی بے وقعتی کا عالم ملاحظہ ہو:

> "۔۔۔ٹرک کی اگلی نشست پر ایک شخص جھول رہا تھا۔ گولی اس کی گردن میں پیوست ہو گئی تھی۔ جہاں گولی کا چھید تھا وہاں سے خون دھار بنا کر بہہ رہا تھا۔ کامران نے اسے پہچاننا چاہا تو یہ دیکھ کر بوکھلا گیا کہ بری طرح مضروب شخص کوئی اور نہیں وہ خود تھا۔"[۱۹]

مذکورہ بالا افسانے 'آدمی کا بکھراؤ" کا کردار "کامران" دنیا کے تعاقب میں اس قدر مگن ہو جاتا ہے کہ اسے موت کا گمان بھی نہیں۔ حتیٰ کہ موت اس تک آن پہنچتی ہے۔ موت کے آنے تک کارِ جہاں اس کی شخصیت میں اس قدر خرابی مچا دیتا ہے کہ اس کی تمام حسیں مر جاتی ہیں اور موت آنے تک وہ خود کی ہی پہچان کھو دیتا ہے۔ کامران کے حال کو مصنف مزید یوں بیان کرتا ہے:

> "اس کی مصروفیات اس قدر بڑھ گئی تھیں کہ وہ احساس کی وہ سطح چھونے کا جھنجھٹ ہی نہ پال سکتا تھا جس میں تعلق گہرا ہو کر روحانی چھب دینے لگتا ہے۔"[۲۰]

درج بالا حوالہ اس بات کا مظہر ہے کہ عصرِ حاضر کی مادہ پرستی نے انسان کی روحانی اقدار کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ انسان کسی دوسرے انسان کی روحانی ضروریات تو کیا ہی پوری کرنے کے قابل ہو سکتا ہے کہ جب اسے خود اپنی محسوسات، احساسات اور روحانی ضرورتوں کا ہی ادراک نہیں۔ حمید شاہد نے اپنے افسانوں میں آج کے انسان کی اس روحانی پستی کو موضوع بنا کر قاری کی فہم کو بیدار کیا ہے۔

جنس اور عورت کی بابت بدلتے ہوئے زاویے بھی عالمگیریت کے تحت منتہا تک پہنچ چکے ہیں۔ انتہائی سنگین حالات میں بھی ایک مرد کے ذہن میں ایک پیشہ ورانہ عورت کے متعلق منفی قسم کے خیالات ہی سر گرداں رہتے ہیں۔ یہ تناظرات حقوقِ نسواں کی تحریک کے ثمرات بھی ہو سکتے ہیں۔ اس تحریک میں عورت کے حق میں جس چیز کا مطالبہ سب سے زیادہ کیا گیا ہے وہ اس کا ذاتی طور پر خود مختار ہونا اور مالی طور پر مستحکم ہونا ہے۔ عالمگیری معاشرے میں سند اور ملازمت عورت کے لیے لازمی ہیں اور تیسری دنیا کے معاشروں کو حقیقت پسندانہ نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ لوازمات عورت کے رشتہ ازدواج کے انسلاک میں بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ کئی عورتیں صرف اسی جواز کی بنا پر ملازمت کے لیے نکلتی ہیں لیکن افسوس کہ گھر کی چوکھٹ پار کرتے ہی اکثر کو یہ صورت حال درپیش ہوتی ہے گویا وہ کسی منڈی میں داخل ہو رہی ہیں، جہاں ان کی قیمت ان کی قابلیت سے زیادہ ان کے ظاہری وجود کی بنا پر لگائی جاتی ہے۔ اس ضمن میں محمد حمید شاہد کے افسانے "جنگ میں محبت کی تصویر نہیں بنتی" سے عورت کی نمائشی حیثیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

> "یہ عورت کا بالعموم وتیرہ ہوا کرتا ہے کہ وہ دیکھی جائے۔ ہمارے اپنے افسانہ نگاروں نے عورت کے دکھنے کی خواہش اور مرد کی دیکھنے کی اشتہا اور نظر بازی کی عادت کو ایک ساتھ رکھ کر کئی ایک کہانیاں لکھ لی ہیں۔ کبھی کبھار تو لگتا ہے بس ہمارے ہاں اس ایک تجربے کو ہی اہمیت حاصل رہی ہے۔ عورت بن سنور کر نکلتی ہے دکھنے کے لیے اور مرد اس کے تعاقب میں ہوتا ہے نظر بھر کر دیکھنے کے لیے۔"[۲۱]

درج بالا حوالے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر عورت کی نمود و نمائش ایک طرف اس کی پیشہ ورانہ ضرورت بن چکی ہے تو دوسری طرف مرد نے بھی اسے ایسے ہی روپ میں متصور کرنا شروع کر دیا ہے اس لیے اس ذیل میں فقط عورت کو قصور وار ٹھہرانا مناسب نہیں بلکہ مرد بھی عورت کی اس نئی گھڑت میں برابر کا شریک ہے۔ صارفی عہد میں عورت کا جسم اشتہار کی کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا ہے۔ اس ذیل میں صارفی معاشرے میں عورت کی نمود کا اظہار محمد حمید شاہد کے افسانے "آدمی کا بکھراؤ" کے اس اقتباس میں بخوبی ہوتا ہے:

> "کامران ریموٹ ہاتھ میں لیے ٹیلی وژن کے چینل بدلتا رہتا۔ کبھی تو وہ اتنی تیزی سے چینل بدلتا کہ پورا بیڈ روم پلکیں جھپکتا ہوا محسوس ہوتا۔ ایسے میں اس کا ہاتھ ان ہاٹ چینلز پر بھی نہ رکتا جو ایک عرصہ تک اسے بہت مرغوب رہے تھے، ننگی رانیں اور کھلے سینے دکھانے والے ان چینلز کو دیکھتے دیکھتے وہ فائزہ سے اوب گیا تھا۔"[۲۲]

درج بالا حوالے کو مدِ نظر رکھیں تو عورت کی اشتہاری حیثیت کا خوب تعین ہوتا ہے۔ عورت کا ایسا استعمال لاتعداد معاشرتی مسائل کو جنم دیتا ہے۔ اول تو گھریلو عورت کا استحکام داؤ پہ لگ جاتا ہے کیونکہ اشتہاری عورتوں کے مقابل ان کے وجود میں وہ کشش نہیں ہوتی جو کسی کو ان کی طرف مستقلاً مائل کر سکے۔ عالمگیری عہد میں اخلاقیات کی بحثیں سرے سے کوئی معنی نہیں رکھتیں، مادہ کی اہمیت ہی مسلم ہے۔ ایسے میں جب گھریلو عورت کا موازنہ اشتہاری عورت سے کیا جاتا ہے تو از خود خانگی رخنے پیدا ہونے لگ جاتے ہیں۔ اس ذیل میں دوسرا اہم مسئلہ مرد کی جنسی نفسیات کی پرودگی میں خلل واقع ہونا ہے۔ مرد از خود اشتہاری عورت کو اپنے لیے جائز تصور کر لیتا ہے اور رفتہ رفتہ تصور کی دنیا میں بسی اشتہاری عورت سے بازاری عورت تک کا راستہ ماپ لینا مرد کے لیے آسان ہونے لگتا ہے۔ تیسرا مسئلہ ان خواتین کا ہے جنہیں بہ امر مجبوری گھر سے نکلنا پڑتا ہے لیکن ان کے ساتھ معاشرے میں منصفانہ سلوک نہیں کیا جاتا کیونکہ عام طور پر مرد ان عورتوں کو بھی قبیل اول کی عورتوں میں شمار کرتے ہیں۔ عورتوں کے یہ مسائل نئے افسانے کا اہم موضوع ہیں جس پر حمید شاہد نے بھی کہانی کی بنت کی۔

عالمگیری عہد میں افسانے کی زندگی کی بابت سوشل میڈیا کی اہمیت سے مفر نہیں۔ سوشل میڈیا افسانہ نگار کو جب اس سے پرے کی دنیا کا چہرہ کرواتا ہے تو اس پر سوچ کے نئے زاویے منکشف ہوتے ہیں جس سے تحریر کا موضوع روایت سے جدت کا سفر کرتا ہے، افسانہ نویس کے سامنے کہانی کی نئی جہتیں کھلتی ہیں، اس کی اڑان کے لیے فضا بسیط ہو جاتی ہے اور لکھنے کے لیے زمین موزوں ہو جاتی ہے۔ میڈیا نہ صرف افسانے کی نشر و اشاعت میں مد ثابت ہوا ہے بلکہ میڈیا کا افسانے کے موضوعات پر بھی گہرا اثر معلوم ہوتا ہے۔ افسانے میں عالمگیریت، ثقافتی مغائرت، لادینیت، صارفیت، دہشت گردی اور جنس کے متعدد موضوعات اور زاویہ ہائے نگاہ میڈیا کی ہی دین ہیں۔ اس ذیل کی ایک مثال میں محمد حمید شاہد کے افسانے "جنگ میں محبت کی تصویر نہیں بنتی" میں ایک کہانی کار اپنی کہانی کی بنت میں میڈیا کی واردات بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> "۔۔۔ یہ کہانی امریکہ سے وہاں سے بھی جڑ جاتی ہے جہاں سے میڈیا کے مطابق امریکہ پر حملہ ہوتا ہے۔ جی، میڈیا نے اسے امریکہ پر حملہ ہی کہا تھا۔ امریکہ انڈر اٹیک، کی عبارت پوری دنیا میں ہر ٹیلی وژن سکرین پر بلنک ہو رہی تھی۔"[۲۳]

AL-MISBAH RESEARCH JOURNAL
Vol.3, No.3, Sep-2023
Page no: 183-197

درج بالا حوالے سے ظاہر ہوتا ہے کہ افسانے میں ٹیلی وژن کی کارکردگی کہانی کا موضوع بن کے سامنے آرہی ہے۔ میڈیا نے امریکہ پر بیتنے والے حادثے کو حملے کا نام دیا اور ٹیلی وژن کی اسکرین پر نشر کیا تو اسے امریکہ پر حملہ ہی سمجھا گیا اور اسی مد میں امریکہ کے لیے ہمدردی بھی جائز سمجھی گئی۔ گویا جو میڈیا دکھاتا ہے یا جو میڈیا کہتا ہے، ناظر کے لیے وہی پہلا تاثر تادیر قائم رہتا ہے۔ پھر محمد حمید شاہد کے افسانہ "گانٹھ" سے میڈیا کے ایک وصف کی نقل پیش ہے:

> "۔۔ جہاز میں سوار ہوتے ہوئے اس پر کھلا کہ ایک سو پچیس دوسرے پاکستانی بھی ڈی پوٹ کیے جا رہے تھے۔ دنیا بھر کے میڈیا والے سب کی تصویریں اور ٹیلی رپورٹس بنا رہے تھے۔ وہ سب مجرم ثابت نہیں ہوئے تھے مگر انہیں امریکہ سے نکالا جا رہا تھا۔ یوں، کہ جیسے وہی مجرم تھے۔ ساری رپورٹس براہِ راست چلائی گئیں۔ اخبارات کی زینت بنیں۔ ٹیلی ویژن کے مختلف چینلز انہیں کئی روز تک وقفے وقفے سے چلاتے رہے کہ یہ ساری کاروائی دہشت گردی کے خلاف عالمی سطح پر مہم جوئی کا حصہ تھی۔۔"[۲۴]

درج بالا حوالے کے ضمن میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ میڈیا کسی حد تک پروپیگنڈہ کا دوسرا نام ہے۔ بعض اوقات پروپیگنڈہ کو افواہ پر ہی محمول کیا جاتا ہے تاہم پروپیگنڈا اور افواہ کے مابین یہ تفریق ہے کہ پروپیگنڈہ میں باقاعدہ، منظم اور مالی اعانت پر مبنی مہم کے ساتھ کام کیا جاتا ہے جو افواہ کے مقابل اس کی طاقت میں اضافے کا باعث ہے۔ اس تناظر میں درج بالا حوالہ دیکھیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ میڈیا نے جس طریقے سے عوام تک پہنچایا اسے بغیر کسی تصدیق کے من و عن دیکھنا ہی عوام کے لیے ضروری ہے۔ بعد میں خواہ معاملات کی تحقیقات ہوتی رہیں لیکن پہلی بار جو خبر میڈیا سے نشر کی جاتی ہے وہ تادیر مؤثر رہتی ہے۔ اردو افسانے میں پروپیگنڈہ کا موضوع میڈیا کی ہی دین ہے ورنہ اس سے قبل کہانی میں اس قبیل کے موضوعات پر اتنی تفصیلات نہیں ملتی تھیں۔ میڈیا کی دورخی کو محمد حمید شاہد کے افسانے "آدمی کا بکھراؤ" کے اس اقتباس میں محسوس کیا جا سکتا ہے:

> "۔۔یونیورسٹی میں ایک تقریب تھی۔۔سب کچھ معمول کے مطابق جا رہا تھا کہ ساتھ بیٹھے شخص کو اپنے سیل فون پر ایک ایس ایم ایس موصول ہوا۔ اس نے ان باکس میں جا کر اس میسیج کو پڑھا تو اس کے چہرے کی ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔۔ جبراً اپنی ذمہ داریوں سے الگ ہونے والے عدالتی نظام کے چیف کے کراچی پہنچنے پر گولی چلنے سے کئی لوگ مارے گئے تھے۔۔۔۔وہ چاہتا تھا کہ فوراً گھر پہنچ جائے مگر واپسی پر حکومتی ریلی میں پھنس گیا۔۔۔گھر پہنچا تو نجی ٹی وی چینل کراچی کی سڑکوں پر لاشیں گرانے کا منظر دکھا رہے تھے۔ اس نے چینل بدل دیا۔ سرکاری ٹی وی پر اس ریلی کا منظر دکھایا جا رہا تھا جس میں وہ پھنس گیا تھا۔"[۲۵]

اس بات سے تو مفر نہیں کہ آج کا زمانہ معلومات کی فوری ترسیل کا زمانہ ہے۔ خبریں منٹوں میں موبائل کے ذریعے دنیا بھر میں نشر ہو جاتی ہیں۔ لیکن ضروری نہیں کہ ہر خبر درست ہو۔ ان میں منفی خبریں بھی شامل ہوتی ہیں۔ منفی خبروں سے مراد محض جھوٹی خبریں نہیں بلکہ وہ سچی خبریں بھی ہیں جو معاشرے میں بد نظمی اور انتشار کا باعث بنتی ہیں۔ اس قبیل کی خبروں میں ناگہانی اموات، معاشرتی زبوں حالی، جنگ و جدل

اور خون خرابوں پر مبنی خبریں شامل ہوتی ہیں۔ یوں یہ خبریں مبنی بر حق ہونے کے باوجود ذہنی خلفشار کا باعث بن سکتی ہیں۔ ان کی بنیاد پر کوئی بھی صحت مند آدمی نفسیاتی عارضے میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ درج بالا حوالے میں بھی شہر میں دہشت گردی کی جس خبر کی جس انداز میں تشہیر کی گئی ہے وہ ایک اچھے خاصے اعصاب کے مالک کے لیے بھی فوری طور پر برداشت کرنا مشکل ہے، کمزور دل انسان کے لیے تو ایسی خبر کسی نفسیاتی عارضے کا شاخسانہ بھی بن سکتی ہے۔ بد قسمتی سے ہمارے ہاں نفسیاتی عارضے کو پاگل پن کے زمرے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ایک اچھا خاصا صحت مند آدمی بھی ذہنی خلجان کا شکار ہو سکتا ہے۔ اس خلجان کی وجوہات میں منفی خبریں بھی شامل ہیں۔

میڈیا کی حد سے زیادہ فعالیت نے انسان کی نفسیات بگاڑنے میں خاصا کردار ادا کیا ہے یہاں تک کہ بعض افراد اپنے معمولات سر انجام دینے کے لیے بھی متوازن نہیں رہے۔ اردو افسانے میں اس قسم کے موضوعات کی شمولیت اگرچہ افسانے سے لطیف عناصر کو خارج کرنے کی طرف ایک قدم ہے لیکن یہ جدید دور کی ضرورت بھی ہے کیونکہ افسانے کے ذریعے قاری کو موجودہ حالات سے باخبر رکھنا بھی بہر حال افسانہ نویس کی ذمہ داری ہے۔ اسی سلسلے میں مذکورہ بالا افسانے "آدمی کا بکھراؤ" سے میڈیائی یلغار کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

> "جن دنوں اسے معمول کی خبروں سے کوفت ہونے لگی تھی ان دنوں اس نے ایسے چینلز ٹیون کر لیے تھے جن کے ذریعے وہ بریکنگ نیوز کی تھرل سے جڑے ہوئے تھے۔ ٹکڑوں میں آنے والی خبروں میں بہت کچھ ٹوٹ رہا تھا۔ حتیٰ کہ وہ لاشیں گرائے جانے والے منظر سے لطف لینے لگا۔"[۲۶]

درج بالا حوالے سے ظاہر ہوتا ہے کہ شروع شروع میں انسان خبروں میں جس زاویے سے دلچسپی لیتا ہے بعض اوقات وہ زاویہ نگاہ تبدیل ہو جاتا ہے۔ دراصل مختلف اذہان پر مختلف خبریں مختلف انداز سے اثر انداز ہوتی ہیں۔ اولاً ناظر سنسنی خیز خبروں کی تلاش میں رہتا ہے لیکن رفتہ رفتہ یہی سنسنی اس کے دماغ کو منفی حرکات کی طرف راغب کرنے کا باعث بھی بن سکتی ہے۔ درج بالا حوالے میں افسانہ نگار نے انسان کی اسی نفسیات کی طرف اشارہ کیا ہے جس کے بگاڑ میں میڈیا کا خصوصی کردار معلوم ہوتا ہے۔ یہیں سے معاشرے میں دہشت اور وحشت جیسے عناصر فروغ پاتے ہیں اور ملک دشمن عناصر منظم ہوتے ہیں۔

محمد حمید شاہد کے افسانے عالمگیری تناظر میں پیش آنے والی ثقافتی مغائرت کے حوالے سے صرف چند کرداروں کی عکاسی نہیں کرتے بلکہ ان کے افسانے پورے معاشرے کی بدلتی ہوئی صورت حال کے عکاس ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں نہایت باریک بینی سے بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار کو پیش کیا ہے اور معاشرے پر اس تغیر کے اثرات کو کہانی کی صورت میں بُنا ہے۔ ان کے افسانوں میں تہذیب و ثقافت کی بدلتی ہوئی صورتیں اس معاشرتی سفر کی داستانیں ہیں جو مغرب کی بدولت مشرق کو درپیش ہیں۔ ان کے افسانے کا اصل محرک محض کہانی پیش کرنا نہیں بلکہ قاری کی سوچ پر یہ دستک دینا ہے کہ وہ ثقافتی غلبے کو صرف بقدر ضرورت خود پر حاوی ہونے دے تاکہ معاشرے میں اندھی تقلید اور رسوم کے فروغ کا سدباب ہو سکے۔ انسانی نفسیات کا گہرا مطالعہ ان کے افسانوں میں واضح نظر آتا ہے اور یہ مطالعہ ان کے کردار اور کہانی کو گنجلک بنانے کی بجائے سبک بنا دیتا ہے۔ یہ نفسیاتی پہلو ان کے افسانے کو قاری سے قریب تر کر دیتے ہیں۔ بلاشبہ باشعور قاری ہی کے ذریعے اردو افسانے کی جدید صورت اپنے ہدف حاصل کر سکتی ہے اور حمید شاہد کے افسانوں میں یہ خوبی موجود ہے کہ وہ اپنے قاری پر فہم کے کئی در وا کر دیتے ہیں۔

## حوالہ جات:

[1] یاسر ندیم، گلوبلائزیشن اور اسلام، (کراچی: دارالاشاعت، ۲۰۰۴ء)، ص۵۸، ۵۷۔

[2] عبداللہ خان خویشگی (مولف)، فرہنگِ عامرہ، (لاہور: الفیصل ناشران، ۲۰۱۹ء)، ص:۳۸۶۔

[3] فرہنگِ آصفیہ، مؤلف: خان صاحب مولوی سید احمد دہلوی (لاہور: الفیصل ناشران، ۲۰۱۹ء) جلد سوم (س تا ک)، ص:۱۸۴۷۔

[4] ناصر عباس نیّر، ڈاکٹر، مابعد جدیدیت- نظری مباحث، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء) ص:۳۱۸۔

[5] محولہ بالا، ص:۲۵۷۔

[6] نجیبہ عارف، ڈاکٹر، ادب کا نومزاحمتی رجحان، (پاکستانی افسانے پر نائن الیون کے اثرات)، (اسلام آباد: پورب اکادمی، طبع اول ۲۰۱۱ء)، ص:۲۲۔

[7] ارشد محمود ناشاد، ڈاکٹر، عالمگیریت کے اردو ادب پر اثرات-صورت حال اور تحفظات، مشمولہ: عالمگیریت، ثقافت اور ادب، مرتبہ: حنا جمشید (فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۹ء)، ص:۵۲۔

[8] محمد حمید شاہد، دہشت میں محبت، (جہلم: بک کارنر، ۲۰۱۵ء) ص۶۸۔

[9] محمد حمید شاہد، مرگ زار، (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۴ء) ص:۸۱۔

[10] محمد حمید شاہد، مرگ زار، ص:۸۲۔

[11] ایضاً۔

[12] محمد حمید شاہد، دہشت میں محبت، ص:۱۳۳۔

[13] محولہ بالا، ص:۱۳۱-۱۳۲۔

[14] محمد حمید شاہد، مرگ زار، ص:۳۶۔

[15] محمد حمید شاہد، دہشت میں محبت، ص:۳۵۔

[16] محولہ بالا، ص:۳۲۔

[17] محولہ بالا، ص:۱۳۳۔

[18] محمد حمید شاہد، مرگ زار، ص:۱۰۶۔

[19] محمد حمید شاہد، دہشت میں محبت، ص:۱۳۴۔

[20] محولہ بالا، ص:۱۳۶-۱۳۷۔

[21] محولہ بالا، ص ۷۲۔

[22] محولہ بالا، ص:۱۳۷۔

[23] محولہ بالا، ص:۵۸۔

[24] محمد حمید شاہد، مرگ زار، ص:۸۴۔

[25] محمد حمید شاہد، دہشت میں محبت، ص:۱۳۲-۱۳۳۔

[26] محولہ بالا، ص:۱۳۷۔